کٹا ہوا ہاتھ

شمیم حنفی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کٹا ہوا ہاتھ

(اسرار آمیز کہانیوں کے سلسلے کی دوسری کتاب)

شمیم حنفی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

© صبا شمیم حنفی

تقسیم کار
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ: بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

اگست ۱۹۹۶ء تعداد 1000 قیمت 7/50

برٹی آرٹ پریس (پرنٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دیا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

یہ کتاب

حیران کر دینے والے واقعات اور سر چکرا دینے والے کرداروں کی لمبی کہانی کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔

اربذان نامی پر اسرار لٹیرے کی جو کہانی پچھلی کتاب میں شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں بھی آپ کی ملاقات اربذان سے ہوگی۔ اس کا قصہ ختم ہوگا اس سلسلے کی اگلی یعنی تیسری کتاب میں — مگر کہانیوں کا یہ پورا سلسلہ کہیں پانچ یا چھے کتابوں میں جاکر مکمل ہوگا۔

اس کتاب میں دو کہانیاں شامل ہیں۔ ایک تو کٹے ہوئے ہاتھ کی کہانی۔ دوسری فاطمہ کی کہانی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں الگ الگ بھی اچھی لگتی ہیں اور ایک سلسلے کا حصّہ ہونے کے باوجود ادھوری محسوس نہیں ہوتیں۔

میں نے پچھلی کتاب میں عرض کیا تھا کہ یہ کہانیاں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں پڑھتے وقت یہ خیال نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کہانیوں کی فضا اور ماحول میں ضروری تبدیلیاں کی ہیں۔ زبان کا انداز بھی سنانے والا رکھا ہے۔ انسان نے لکھنا تو بہت بعد میں سیکھا۔ کہانیاں سننے اور سنانے کا رواج اُس وقت بھی تھا جب کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا چلن شروع نہیں ہوا تھا۔

اسی لیے تو کتنی ہی کہانیاں ہم تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں۔ وہ کہانیاں کس نے گڑھی تھیں؟ کب گڑھی تھیں؟ کچھ پتا نہیں۔

ان کہانیوں کے بارے میں بھی بس اتنا جان لیجیے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ کہانیاں ہاف نامی ایک بزرگ نے کوئی دو سو برس پہلے لکھی تھیں۔

۱۷ مئی ۱۹۸۶ء

شمیم حنفی

کٹا ہوا ہاتھ

زالیوکوس نے ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں۔ لوگ اُس کے اور قریب سمٹ آئے۔ اور زالیوکوس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

میری پیدائش قسطنطنیہ میں ہوئی۔ میرے والد ریشمی کپڑوں اور عطریات کا کاروبار کرتے تھے۔ اُنھیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مجھے ابتدائی تعلیم خود والد نے دی۔ پھر مجھے ایک مذہبی پیشوا کے سپرد کر دیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ بڑا ہو کر میں ان کا کاروبار سنبھال

لوں۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس ناچیز کو حکمت سے زیادہ دلچسپی ہے تو اپنے کچھ دوستوں سے مشورے کے بعد میرے لیے انھوں نے طبابت کا پیشہ تجویز کیا۔ اُن دنوں قسطنطنیہ میں اچھے طبیب بہت کم تھے۔ سو مالی اعتبار سے بھی یہ پیشہ خاصا نفع بخش ثابت ہوتا۔

ملک فرانس کے کئی باشندوں کی میرے والد سے رسم و راہ تھی۔ ایک روز ایک فرانسیسی میرے گھر آیا۔ اس نے والد کو بتایا کہ اس کے ملک میں طبابت کے پیشے کی تربیت بہت اچھی دی جاتی ہے کیوں نہ مجھے بھی فرانس بھیج دیا جائے۔ اس بزرگ نے یہ بھی کہا کہ جب وہ لوٹ کر اپنے ملک کو جائے گا تو مجھے اپنے ساتھ لیتا جائے گا۔ والد کو یہ تجویز پسند آئی۔ تین ماہ بعد سفر مقرر ہوا۔ میں بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس طرح دنیا دیکھنے کا موقع ملے گا۔ سیر تماشے سے دلچسپی خدا داد تھی۔

اُس فرانسیسی بزرگ نے جب ہمارے ملک میں اپنا کام ختم کر لیا اور وطن واپس جانے کی تیاری شروع کی تو میں نے بھی سفر کے انتظامات مکمل کیے۔ جس روز شام ڈھلے ہمیں رخصت ہونا تھا والد نے

مجھے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ ایک میز پر عمدہ عمدہ ملبوسات، اسلحہ جات اور سونے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

والد نے اس ناچیز کو گلے سے لگایا اور بولے:

"یہ سب کچھ تمھارا ہے۔ جو اسلحے تم دیکھ رہے ہو تمھارے دادا حضور نے مجھے اُس وقت عطا کیے تھے جب میں نے تلاشِ معاش میں پردیس کے سفر کی ٹھانی تھی۔ تم ان کا استعمال صرف اپنی حفاظت کے لیے کرنا۔ بے سبب کسی کو ضرب پہنچانے کا خیال ہرگز جی میں نہ لانا۔ اور سونے کا یہ ڈھیر میں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ دوسرا میرے لیے چھوڑ دو۔ اور تیسرے حصے کو صرف اس وقت ہاتھ لگانا جب تم پر اچانک کوئی بُرا وقت آن پڑے۔"

یہ کہتے کہتے والد کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شاید انھیں وہم ہو گیا تھا کہ اس شام کے بعد دوبارہ ملنا ہمارے نصیب میں نہیں ہے۔

سفر جوں توں تمام ہوا۔ چھٹے دن ہم پیرس جا پہنچے۔ اُس مردِ بزرگ نے جس کا میرے والد سے یارانہ تھا، اور جو اب مجھے بھی مثل دوست کے عزیز رکھتا تھا میرے لیے ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔ پھر مجھے صلاح دی

کہ اپنے مال کی طرف سے چوکنا رہوں اور اُس کی حفاظت کروں۔

رفیقو! اس ناچیز نے تین برس اُس آبادی میں گزارے۔ طبابت کے پیشے سے متعلق ہر بات سیکھ لی۔

جرّاحی میں ماہر ہو گیا۔ ہزاروں نسخے ازبر ہو گئے۔ اس عرصے میں بہت کم لوگوں سے میری دوستی رہی۔ اُس ملک کے لوگوں کی اخلاقی حالت اس ناچیز کو قدرے بیزار رکھتی تھی۔ لوگ طرح طرح کے لہو و لعب میں مبتلا رہتے تھے۔

اب گھر کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ والد کے احوال سے بھی میں یکسر بے خبر تھا۔ سوچا، جلد از جلد وطن لوٹ جاؤں۔ ایک جماعت اُن دنوں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ باندھ رہی تھی۔ میں نے اس کے افراد سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر مجھے بھی ساتھ لے جانے پر وہ رضامند ہو تو راستے بھر ان کی صحت اور دوا علاج کی خدمت انجام دوں گا اور اس کے عوض اُن سے ایک پائی نہ لوں گا۔ انھوں نے یہ خدمت قبول کر لی اور میں چین آرام سے اُن کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ مکان کے صدر دروازے پر ایک بڑا سا قفل لگا ہے۔ پڑوسی اتنے عرصے بعد مجھے جیتا جاگتا دیکھ کر حیران ہوئے۔ پھر بتایا کہ والد اس ناچیز کے، دو ماہ قبل ایک بیماری کے ہاتھوں فوت ہو چکے ہیں۔ گھر کی چابی اُس مذہبی پیشوا

کے پاس تھی جس نے مجھے کچھ عرصہ تعلیم دی تھی۔ میری آمد کا حال سن کر وہ بزرگ خود آیا اور چابی ساتھ لایا۔ میں نے قفل کھولا اور ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ آنکھیں چار طرف والد کو ڈھونڈتی تھیں۔ گھر میں سارا مال اسباب جوں کا توں دھرا تھا۔ البتہ اشرفیوں کا وہ ڈھیر جو والد نے کسی بُرے وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑنے کی تاکید کی تھی، غائب تھا۔ پیشوا نے کہا کہ والد نے انتقال سے پہلے وہ رقم معبد کی تعمیر کے لیے دے دی تھی۔

میں کیا کرتا؟ ناچار اُس کی بات مان لی ویسے

یہ بھید میری سمجھ میں نہ آیا۔ کوئی گواہ تو تھا نہیں کہ اپنی حمایت کے لیے حاضر کر دیتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم گھر اور گھر کا ساز و سامان تو محفوظ رہ گیا۔

عزیزو! یہ اس ناچیز پر بدنصیبی کا پہلا وار تھا۔ پھر تو یکے بعد دیگرے مصیبتیں آتی گئیں اور جیناد شوار ہو گیا۔ طبابت میں کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ میرے والد مرحوم اُس ملک کے ایک با اثر شہری تھے وہ زندہ ہوتے تو اس ناچیز کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے میں ایک دم بے سہارا ہو گیا تھا میں نے لاکھ جتن کیے کہ جو تجارتی سامان گھر میں موجود ہے اُسی کو اونے پونے فروخت کروں۔ لیکن اب نئے نئے تاجروں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ میرے مال کا کوئی خریدار نہ تھا۔

ایک روز خیال آیا کہ ملک فرانس میں ہمارے یہاں کی اشیاء خاصی پسند کی جاتی ہیں۔ کیوں نہ وہیں چل کر قسمت آزمائی کی جائے؟ میں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

قیاس درست نکلا۔ جو بھی سامان تجارت کا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا، سب کا سب اچھے داموں پر

بک گیا۔ میں نے اور سامان وہیں کے بازاروں سے خریدا اور اُسے بھی وہیں کے وہیں بیچ دیا۔ خوب منافع ہاتھ آیا۔ طبابت کا کام بھی چل نکلا۔ میں جس جس شہر میں جاتا، وہاں پہنچتے ہی ڈوگڈی بجوا کر اعلان کرا دیتا کہ ایک حاذق یونانی طبیب اُس شہر میں وارد ہوا ہے۔ مریضوں کی بھیڑ لگ جاتی۔

میں نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت دولت کمائی۔ پھر جی میں یہ سمائی کہ اب کسی اور ملک کا رُخ کیا جائے۔ میں نے بہت سارا فرانسیسی سامان خریدا اور اطالیہ کی راہ لی۔ شہر فلورنس میں اپنا ڈیرا جمایا۔ خوبصورت بستی تھی۔ ایک دکان کرایہ پر لی۔ قیام کا انتظام ایک سرائے میں ہو گیا جو دکان سے قریب ہی تھی۔ پُرفضا مقام تھا اور ہر طرح کا آرام اس سرائے میں میسّر تھا۔ جلد ہی لوگ مجھے ایک تاجر اور ایک طبیب کی حیثیت سے جان گئے۔ کاروبار یہاں بھی چمک گیا۔ عزیزو! سبب اس کامیابی کا یہ تھا کہ ہر چند میں اپنا مال اونچے داموں پر بیچتا تھا، مگر لوگ میرے حسن اخلاق کے گرویدہ تھے۔

ابھی فلورنس میں دس روز گزرے تھے کہ

ایک شام، جب میں دن بھر کا حساب کتاب دیکھ رہا تھا،
ایک صندوقچے میں مجھے ایک رقعہ ملا۔ اس پر لکھا تھا کہ
اُسی دن جب آدھی رات اِدھر ہو اور آدھی رات
اُدھر، میں ایک معیّنہ مقام پر پہنچ جاؤں۔ خدا جانے
کون اس رقعے کا لکھنے والا تھا۔ بہت سوچا، کچھ یاد
نہ آیا۔ اس بستی کے کسی بھی شخص سے میرے قریبی
تعلقات نہ تھے۔ پھر یہ رقعہ کس نے بھیجا تھا؟ آخر یہ
سوچ کر اس الجھن سے نجات پائی کہ کسی مریض کو
خفیہ طریقے سے دیکھنا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ
ایسا ہو چکا تھا۔ میں نے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ساتھ ہی
والد مرحوم کے دیے ہوئے کچھ ہتھیار بھی سنبھال کر رکھ
لیے کہ کوئی انہونی بات ہو جائے تو اپنی حفاظت کر سکوں
آدھی رات سے اک ذرا پہلے میں چل دیا۔ اُس
پُل پر جا پہنچا جہاں مجھے بلایا گیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا
تھا اور ایک عجیب سی سنسنی۔ ٹھنڈ غضب کی تھی۔
پورا چاند آسمان پر روشن تھا۔ نیچے دریا کی لہریں چاندنی
میں جگمگا رہی تھیں۔ آس پاس نہ کوئی آدمی نہ آدم
زاد۔ اتنے میں آدھی رات کا گجر بجا۔ میں نے کچھ آہٹ
سی محسوس کی اور چونک کر سامنے دیکھا تو نظر ایک

لمبے تڑنگے شخص پر پڑی۔ اُس نے سرخ رنگ کے
لبادے میں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا
ہوا تھا۔
مجھے کچھ ڈر سا لگا۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے
میں نے کہا: "کیا تم نے مجھے بلایا ہے؟"
"ہاں! میرے پیچھے پیچھے آؤ" لبادے والے نے
بس اتنا جواب دیا اور ایک طرف چل پڑا۔ میرے دل میں
کچھ اور دہشت سما گئی "جاؤں کہ نہ جاؤں؟" ایک
لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ پھر اُسے مخاطب کیا: "اتنا
تیز نہ چلو دوست! پہلے یہ تو بتاؤ کہ ہمیں جانا کہاں ہے
پھر مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ کہ میں تمھیں سمجھ تو سکوں!"
"زالیوکوس! اگر تم نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ!"
اجنبی نے زہریلے لہجے میں کہا اور تیز تیز چلنے لگا۔
میں چیخ کر بولا "تو کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟
بلا جانے بوجھے اس سنسان اور سرد رات میں تمھارے
ساتھ چلا چلوں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے لپک کر اُسے
پکڑنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ میں اپنا خنجر سنبھالا،
دوسرا ہاتھ اس کے لبادے پر ڈالا۔ اجنبی تو لبادے
سے نکل کر یہ جا وہ جا! بس لبادہ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔

غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں نے یہ سوچ کر دل کو سمجھایا کہ اس کا لبادہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ شاید اس کی مدد سے کچھ پتا چلے، بھید کھلے۔ میں نے لبادہ اپنے کاندھے پر ڈالا اور گھر کی راہ لی۔ ابھی مشکل سے سو گز کا راستہ طے کیا ہوگا کہ کسی نے مجھے دھیرے سے چھوا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "آج رات کچھ بھی نہیں ہو سکتا سردار، اپنی حفاظت کرو!"

میں نے مڑ کر اسے دیکھنا چاہا، مگر پلک جھپکتے میں وہ اجنبی بھی غائب ہو چکا تھا۔ یہ بات صاف تھی کہ اس نے سرخ لبادے والے کو خبردار کرنا چاہا تھا اور مجھ پر اُسے اس لمبے تڑنگے اجنبی کا دھوکا ہوا تھا۔

دوسرے دن میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ پہلے جی میں آئی کہ اس لبادے کے سلسلے میں اعلان کروا دوں۔ جس کا ہو آئے اور لے جائے۔ پھر خیال آیا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ جسے غرض ہو گی آپ ہی آئے گا۔ میں نے بہت غور سے لبادے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت عمدہ قیمتی مخمل کا بنا ہوا تھا اور سونے کے تاروں سے کڑھا ہوا۔ میں نے آخر میں ایک ترکیب سوچی۔ لبادے کو دکان پر ٹانگ دیا اور جان بوجھ کر اس کی قیمت

اونچی رکھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کوئی خریدتا ہے یا نہیں۔ اس لمبے تڑنگے اجنبی کو صرف اس کے غیر معمولی قد کی وجہ سے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

کئی لوگ اس لبادے کو دیکھنے کے لیے آئے لیکن کوئی بھی دو سو اشرفیوں میں مول لینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ایک شخص جو لالچ بھری نظروں سے لبادے کو دیکھ رہا تھا اس سے میں نے پوچھا کہ اس شہر میں کسی اور دکان پر بھی ایسا لبادہ مل سکتا ہے؟ اُس نے کہا "نہیں!"

دن گزرا۔ شام آئی۔ اتنے میں ایک نوجوان دکان میں داخل ہوا۔ لبادے پر نظر کی۔ دو سو اشرفیاں گن کر نکالیں اور بولا "مجھے یہ لبادہ اتنا پسند آیا ہے کہ اس کے لیے میں نے سارا سرمایہ خرچ کر دیا — یہ لو!"

میں چکرا گیا۔ مجھے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ کوئی گاہک اتنے مہنگے داموں پر بھی اس لبادے کو خرید سکتا ہے۔ اب کیا کروں؟ یہ سوچ کر خوشی بھی ہوئی کہ مجھے بیٹھے بٹھائے اتنی دولت ہاتھ لگ گئی۔

نوجوان اتنی دیر میں لبادہ لے کر باہر جا چکا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ واپس آیا۔ مجھے ایک رقعہ تھمایا اور بولا "یہ کاغذ شاید غلطی سے لبادے کی جیب میں رہ گیا ہے۔ یہ لو!"

میں نے جلدی سے اسے پڑھا، لکھا تھا۔ "یہ لبادہ لے کر فلاں مقام پر آج رات پہنچو۔ تمھیں وہاں چار سو اشرفیاں ملیں گی۔" اب تو میرے حواس گم ہو گئے۔ مجھے دو سو اشرفیاں اور مل سکتی ہیں — یہ سوچتا ہوا میں دروازے کی طرف لپکا اور چند لمحوں بعد اُس نوجوان کو جا لیا۔ میں نے کہا۔ "اپنی رقم واپس لے لو اور یہ لبادہ مجھے دے دو!"

پہلے تو وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے سنجیدہ دیکھ کر خفا ہو گیا اور مجھ پر گرجنے برسنے لگا۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ میں نے لبادہ چھین لیا۔ اس نے

صدا لگائی اور شہر میں گشت کرنے والے محافظ دستے کے لوگ آن پہنچے۔ مجھے پکڑ کر قاضی کی عدالت میں لے گئے۔ معاملے کی شنوائی ہوئی۔ فیصلہ میرے خلاف ہوا۔ اب میں نے یہ گزارش کی کہ نوجوان کی دو سو اشرفیوں کے علاوہ، سو اشرفیاں میں اپنی طرف سے دینے پر تیار ہوں اگر نوجوان لبادہ مجھے واپس کر دے۔

عزیزو! نوجوان لالچ میں آ گیا۔ میں نے تین سو اشرفیاں اس کے حوالے کیں۔ لبادے پر اپنا قبضہ جمایا اور گھر کی راہ لی۔ میں اب بھی سو اشرفیوں کے فائدے میں تھا۔

بڑی بے چینی سے میں نے آدھی رات کا انتظار کیا۔ پھر گجر بجتے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور معینہ مقام پر جا پہنچا۔

"لبادہ لائے ہو؟" اسی لمحے ترنگے اجنبی نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! اور اس کے لیے سو اشرفیاں بھی گنوا آیا ہوں!" میں نے جواب دیا۔

اجنبی نے کہا: "مجھے پتا ہے۔ لو یہ چار سو اشرفیاں!"

اُس نے چار سو اشرفیاں میرے سامنے ڈال دیں۔ چاندنی میں سونے کی چمک دیکھ کر میرا جی کھل اٹھا۔ میں نے جلدی جلدی تمام اشرفیاں اپنی جیبوں میں بھر لیں اور غور سے اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بس انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں نقاب سے جھانک رہی تھیں۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بولا: "میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ پیارے اجنبی! بس یہ خیال رہے کہ کوئی غیر قانونی خدمت مجھ سے نہ لینا۔"

"ڈرو مت!" اُس نے جواب دیا "مجھے تمھاری جراحی کے تجربے سے کچھ کام لینا ہے تمھیں ایک لڑکی کا سر اس کے تن سے جدا کرنا ہے!"

"کیا؟ کیا؟" میں حیرانی سے چیخ پڑا۔

اجنبی نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "وہ لڑکی زندہ نہیں ہے۔ اس لیے گھبراؤ مت تمھیں ایک لاش کا سر قلم کرنا ہے!"

"میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ کیا معاملہ ہے؟"

میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

اس نے بالکل سرد لہجے میں جواب دیا —

"پوری بات سن لو! پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ میں تم سے کوئی نامناسب کام نہیں لینا چاہتا۔ معاملہ یہ ہے کہ میں اس ملک میں اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں ہم اپنے کچھ رشتے داروں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اچانک میری بہن ایک پُراسرار بیماری کے ہاتھوں چل بسی۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ میرے رشتے دار اسے کل صبح دفنا دیں گے۔ لیکن ہمارے خاندان میں ایک پرانی رسم یوں چلی آتی ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو، چاہے کہیں بھی اس کی موت واقع ہو، ہم اپنے اجداد ہی کی قبروں کے درمیان دفن کرتے ہیں۔ جو بدنصیب پردیس میں مرتے ہیں ان کی لاش کچھ مرہموں اور نسخوں کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ میں اپنی بہن کی لاش اپنے رشتے داروں کے پاس چھوڑ دوں گا۔ لیکن اس کا سر اپنے ساتھ وطن لے جاؤں گا تاکہ بوڑھے والدین اپنی جواں مرگ بیٹی کا آخری دیدار تو کر لیں۔"

میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خاموشی اختیار کی اور اُس کے بار بار کہنے پر اس کام کے لیے

تیار ہو گیا۔ البتہ ایک سوال مجھے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ "اگر معاملہ اتنا ہی سیدھا سادا ہے تو وہ رات کے سناٹے میں چوری چھپے یہ کام کیوں کروانا چاہتا ہے؟" طبیعت نہ مانی اور میں یہ بات پوچھ ہی بیٹھا۔ اس نے جواب اس بات کا یہ دیا کہ "رشتے دار سر قلم کرنے کی اجازت نہ دیں گے، لیکن اگر راتوں رات میں نے یہ کر لیا تو پھر انھیں کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دوں گا۔"

میں نے یہ عذر قبول کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے۔ پھر ایک عالیشان حویلی کے سامنے جا پہنچے۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندھیرے میں ہم رُک رُک کر قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ ایک سیڑھی سے اُتر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے، پھر ایک کمرے میں۔ کمرے کی چھت سے ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ خوب روشنی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں بستر پر ایک نوجوان دوشیزہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اجنبی نے اپنا چہرہ پیچھے کی طرف موڑ لیا گویا اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتا ہو۔ پھر مجھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے اپنا خنجر نکالا۔ دوشیزہ کا سارا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف سر چادر سے باہر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ زرد۔ لانبے سیاہ بالوں کی لٹیں سر کے گرد بکھری ہوئی تھیں۔ وہ مرنے کے بعد بھی بالکل ایسی نظر آتی تھی جیسے گہری نیند میں غرق ہو۔ ایسی معصوم صورت دوشیزہ کی لاش کو قریب سے دیکھنا بھی میرے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ میں نے خنجر سنبھالا اور ایک ہی وار میں اس کا حلق کاٹ دیا۔ اچانک — اچانک — لاش نے ایک سسکی لی۔ دوشیزہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور پل بھر بعد دوبارہ بند کر لیں —!

مجھے ایسا لگا کہ زمین پر میرے پانو جم سے گئے ہیں ۔ میرے خدا! وہ لڑکی زندہ تھی جسے مُردہ سمجھ کر میں نے اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ لیکن اب ـــــ اب وہ واقعی مر چکی تھی ۔ میرے خنجر کا وار بہت گہرا تھا۔

"یہ میں نے کیا کر ڈالا؟" چند لمحوں تک میرے حواس گم رہے اور رہ رہ کر سینے میں درد کی ایک لہر اُٹھتی رہی ۔ تو کیا سرخ لبادے والے اجنبی نے مجھے دھوکا دیا تھا؟ یا خود اس کی بہن نے موت کا ڈھونگ رچایا تھا؟ ہو سکتا ہے ایسا ہی رہا ہو! میں اس کے بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میری ہمت جواب دے گئی تھی ۔ چپ چاپ میں نے لڑکی کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ مرنے سے پہلے اس کی حلق سے ایک کراہ نکلی تھی ۔ پھر اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں ۔ ڈر سے بے حال ہو کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری میں اندھیرا تھا ۔ چراغ اپنے آپ گُل ہو گئے تھے اور سُرخ لبادے والے کا آس پاس کہیں پتا نہ تھا ۔ میں دیوار کے سہارے چلتا ہوا

زینے تک پہنچا ۔ پھر بہ ہزار خرابی گرتا پڑتا نیچے اُتر آیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا ۔ صدر دروازہ پورے کا پورا کھلا ہوا تھا ۔ باہر نکل کر میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ ابھی تک دل میں دہشت سمائی ہوئی تھی ۔ میں گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا ۔ پھر بستر پر گر کر تکیے میں منھ چھپا لیا ۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ سب کچھ بھول جاؤں جو ہو چکا ہے ۔ لیکن ـــ نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی ۔ بڑی مشکل سے صبح ہوتے ہوتے میرے اوسان بحال ہوئے ۔ مجھے یقین تھا کہ جس اجنبی نے میرے ہاتھوں یہ جرم کرایا ہے، مجھے بے سہارا نہ چھوڑے گا اور میری مدد کو آئے گا ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دُکان پر چلا جاؤں اور لوگوں کے سامنے اس طرح پیش آؤں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں ۔ مگر وائے افسوس! ایک نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی ۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ اپنا خنجر اور چاقو تو میں وہیں چھوڑ آیا ہوں ۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بوکھلاہٹ میں کہیں اور گرا دیا ہو ۔ اب اگر میرے ہتھیار کسی کو مل گئے تو ہو سکتا ہے کہ پکڑا جاؤں!

معمول کے مطابق میں نے دُکان کھولی ۔ میرا

پڑوسی جسے اِدھر اُدھر کی غپ شپ میں بہت مزا آتا تھا، اس نے دروازے سے جھانک کر روز کی طرح مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ پھر اس نے کہا — "تمھیں کچھ پتا بھی ہے؟ پچھلی رات کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" میں نے مری ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ارے! تم نے سُنا ہی نہیں؟" اس نے حیرت سے کہا "پچھلی رات گورنر کی بیٹی بنا کا کو کسی نے قتل کر دیا۔ کیسی حسین دوشیزہ تھی۔ ابھی کل ہی میں نے اسے اس کے منگیتر کے ساتھ سیر کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی!"

اس کا ہر ہر لفظ چاقو کی طرح میرے دل میں اترتا گیا۔ اور یہ عذاب مجھے کئی بار جھیلنا پڑا۔ اس روز جو کوئی بھی دُکان پر آتا بس یہی قصّہ دہراتا۔ لوگ بھانت بھانت کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ مجھے حقیقت معلوم تھی لیکن میں ایسا انجان بنا بیٹھا رہتا جیسے یہ سب کچھ میں پہلی بار سُن رہا ہوں۔ دوپہر ہوتے ہوتے ایک شخص دُکان میں داخل ہوا۔ وہ مقامی

عدالت کا ایک کارندہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اکیلے میں مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے دُکان کے عقبی کمرے میں لے گیا۔

اس نے ایک تھیلے سے میرے اسلحے نکالے پھر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کے ہیں؟"

میں نے سوچا کہ صاف انکار کر دوں۔ لیکن میرے پڑوسی دروازے سے جھانک رہے تھے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ سب اچھی طرح میرے خنجر اور جرّاحی کے دوسرے آلات کو پہچانتے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں یہ سب کچھ میرا ہے۔ کارندے نے کہا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ ناچار میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم ایک بہت بڑی سی عمارت کے سامنے پہنچے۔ یہ شہر کی سرکاری جیل تھی۔ وہاں مجھے ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔

میں اپنے آپ کو ایک دم بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔ کال کوٹھری کی تنہائی میں مجھے بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ میں نے ایک قتل کر دیا ہے، اپنے ارادے سے نہ سہی، دھوکے میں آ کر۔ مگر، بہرحال، جرم تو

میرا ہی ہے۔ مجھے روپے کی ہوس نے اس حال کو پہنچایا تھا۔ سونے کی چمک نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ نہیں تو اس طرح بلا سوچے سمجھے میں اس جال میں کیسے پھنس جاتا؟ گرفتاری کے دو گھنٹے بعد مجھے کوٹھری سے باہر لے جایا گیا۔ ایک لمبے زینے کو پار کرتا ہوا میں ایک بڑے سے ہال میں پہنچا۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک لمبی میز بچھی ہوئی تھی جس پر کالے رنگ کا ایک میز پوش پڑا تھا۔ میز کے گرد بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کے سب بوڑھے، سنجیدہ اور بزرگ صورت۔ ہال میں چاروں طرف جو بنچیں پڑی ہوئی تھیں اُن پر فلورنس کے شہریوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اوپر چھجّوں پر تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جب میں اس میز کے قریب پہنچا تو ایک افسردہ اور ملول صورت شخص نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا اور مجھ پر نگاہ ڈالی۔ یہ گورنر تھا۔ اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ وہ مقتولہ کا باپ ہے اس لیے اس مقدمے کی سماعت اور فیصلے میں خود کوئی حصّہ نہ لے

گا۔ اس نے اپنی جگہ، ان بارہ افراد میں سب سے بوڑھے نظر آنے والے شخص کو بٹھا دیا اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

اس مردِ بزرگ کی عمر کم سے کم نوّے برس رہی ہوگی۔ اس کے کاندھے جھک گئے تھے اور ماتھا سفید بالوں سے ڈھکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی تھیں اور آواز بہت جمی ہوئی اور کڑک دار تھی۔ میں نے گذارش کی کہ مجھے کچھ بولنے کا موقع دیا جائے۔ اجازت ملنے پر میں نے ساری بات بے کم و کاست کہہ سُنائی۔ جب میں اپنا بیان دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ گورنر کا چہرہ کبھی پیلا پڑ جاتا، کبھی لال ہو جاتا۔ میرے چپ ہوتے ہی اس نے گرج کر کہا:

"تم کمینے! تم نے لالچ میں آ کر جو جرم کیا ہے اس کی ذمّے داری کسی اور پر کیوں ڈال رہے ہو؟"

اس مردِ بزرگ نے جو گورنر کی جگہ پر بیٹھا تھا، اس نے گورنر کو جھڑک دیا کہ اس معاملے میں اپنی زبان نہ کھولے اور کہا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے لالچ میں آ کر یہ جرم کیا ہے۔ مقتولہ کے

زیورات تک اس کے جسم پر محفوظ تھے اور ایک چھلّہ بھی غائب نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ گورنر قتل سے پہلے کے حالات پر جو اس کی بیٹی سے متعلق ہوں، جب اچھی طرح روشنی ڈال چکے گا، تبھی اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

پھر اس نے یہ اعلان کیا کہ عدالت اس روز برخاست کی جاتی ہے کیونکہ مقتولہ کے کچھ خطوط کا معائنہ بھی کرنا ہے جو ابھی گورنر کی تحویل میں ہیں۔

عدالت اٹھ گئی۔ مجھے پھر اسی کال کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ دن بھر میرا ذہن اس اُدھیڑ بُن میں لگا رہا کہ آخر اس لڑکی اور سرخ لبادے والے میں کیا تعلق تھا؟

دوسرے دن پھر عدالت میں طلبی ہوئی۔ لمبی میز پر کئی خطوط رکھے ہوئے تھے۔ اس مردِ بزرگ نے مجمع سے سوال کیا کہ یہ خط میں نے تو نہیں لکھے؟ میں نے ایک نظر ان رقعوں پر ڈالی اور اندازہ ہوا کہ جس خط میں مجھے پیغام موصول ہوا تھا اسی خط میں یہ رقعے بھی لکھے گئے ہیں۔

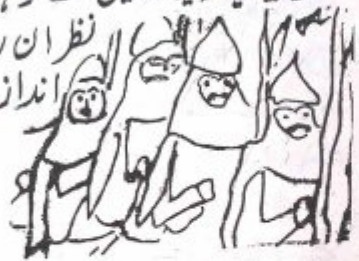

یعنی کہ تحریر ایک ہی شخص کی ہے۔ میں نے یہی کہہ دیا۔ انھوں نے میری بات نہیں مانی کیونکہ ہر خط کے اخیر میں حرف "ز" لکھا ہوا تھا۔ جو میرے نام کا پہلا حرف ہے۔ ان خطوں میں لڑکی کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ شادی نہ کرے۔ اپنی بات کی دلیل کے طور پر میں نے درخواست کی کہ میرے کمرے میں جو پیغام رکھا ہوا ہے اس کا خط ان رقعوں کے خط سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ کمرے کی تلاشی اچھی طرح لی جا چکی ہے اور وہاں کوئی پیغام ہاتھ نہیں لگا ہے۔ آج سارے منصفوں کا رویّہ میری جانب بہت خراب اور سرد مہری کا تھا۔ مقدمے کی کارروائی ختم ہوتے ہوتے میں تمام امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تیسرے روز جب مجھے پھر عدالت میں لایا گیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرا جرم ثابت ہو چکا ہے اور میرے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ تو اب میری زندگی کا خاتمہ ہے؟ میں نے پل بھر کے لیے سوچا۔ بھری جوانی میں، پردیس میں، دوستوں عزیزوں سے دُور، یہ کیسی موت ہوگی!

اُسی شام میں اپنی کال کوٹھری میں بیٹھا اپنے

مقدّر کو کوس رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص اندر آیا۔ گھڑی دو گھڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ــــــ

"زالیوکوس! میں تم سے ملنے آیا ہوں!"

کوٹھری نیم تاریک تھی اس لیے میں اسے پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن یہ آواز مجھے جانی پہچانی سی لگی اور میرے ذہن میں یادوں کا ایک دفتر کھل گیا۔ یہ آواز والیتی کی تھی، میرے فرانس کے زمانۂ قیام کا ایک بہت قریبی دوست۔ اس نے بتایا کہ وہ محض اتفاقاً فرانس آ گیا تھا۔ یہاں اس کا پدر جو ایک معزّز آدمی تھا، اُن دنوں قیام پذیر تھا۔ اس نے شہر میں گھومتے پھرتے اس واقعے کا چرچا سُنا تھا اور چونکہ اس سے میرا نام وابستہ تھا اس لیے اسے میری فکر ہوئی تھی اور پتا لگانے وہ یہاں آ پہنچا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسے ساری بات بلا کچھ چھپائے بتاؤں۔ شاید میری نجات کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ موت سے پہلے میں جھوٹ بول کر اپنی روح کو داغ دار نہ کروں گا۔ پھر میں نے سارا واقعہ اسے کہہ سُنایا۔

"تو تم اس وقت تک بنا کا کو بالکل نہیں جانتے

تھے؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا کہ میں نے اُس وقت تک اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ والیتی نے کہا کہ معاملہ سنگین بھی ہے، پُراسرار بھی۔ گورنر انتقام کے جوش میں لوگوں سے یہ کہتا پھر رہا ہے کہ میں عرصے سے بنا کا کو جانتا تھا اور میں نے اس کا قتل محض غصّے اور رقابت کی وجہ سے کیا ہے، کیونکہ اس کی شادی دوسرے سے ہونے والی تھی۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ یہ بات اگر صحیح ہو بھی سکتی ہے تو اس سُرخ لبادے والے اجنبی کے سلسلے میں جس نے مجھے اس قتل پر اُکسایا تھا۔ کچھ دیر بعد والیتی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور یہ وعدہ کیا کہ میری جان بچانے کے لیے وہ اپنے بس بھر ہر کوشش کرے گا۔ مجھے اب کوئی امید تو رہ نہیں گئی تھی لیکن والیتی بہت عقلمند انسان تھا اور قوانین سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید کوئی راستہ وہ نکال ہی لے۔

دو روز تک میں اسی اُلجھن میں گھرا رہا۔ پھر والیتی دوبارہ ملاقات کے لیے آیا۔ مجھے سینے سے لگایا اور

اُداس لہجے میں بتایا کہ نجات کا ایک راستہ نِکلا ہے، ہرچند کہ یہ راستہ بھی تکلیف دہ ہے۔ مجھے موت کی سزا کے بجائے اب صرف یہ سزا ملے گی کہ میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس نے بتایا کہ گورنر اب اس مقدمے کی دوبارہ سماعت پر آمادہ نہیں تھا لیکن ہزار التجاؤں کے بعد اس بات پر تیار ہو گیا کہ اگر اس واقعے کی کوئی اور نظیر مل سکے جس میں سزا موت کی نہ دی گئی ہو تو وہ میری سزا میں بھی تخفیف کی حمایت کرے گا۔ یہ بات گورنر نے صرف اس لیے مان لی تھی کہ وہ ذاتی طور پر اس واقعے سے متعلق تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ فیصلے پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جائے۔ والیتی اور اس کا پدر دونوں رات دن قانون کی کتابیں کھنگالتے رہے۔ آخرکار اُنھیں ایک نظیر مل ہی گئی جس میں عدالت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ قاتل کو سزائے موت دینے کے بجائے اس کا بایاں ہاتھ قلم کر دیا جائے اور اس کا سارا مال، جائداد وغیرہ ضبط کر لیا جائے۔"

زالیوکوس نے اتنا کہہ کر اُداس نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک خاموشی سے کسی

سوچ میں گُم رہا پھر دھیمے لہجے میں آگے کا قصہ شروع کیا ــــ "اے عزیزو! یہ تھا میری ہوس کا انجام۔ میں ذہنی طور پر خود کو اس آزمایش کے لیے تیار کرتا رہا اور اس لمحے کے بارے میں سوچتا رہا جب ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں میرا ہاتھ قلم کر دیا جائے گا۔

آخرکار، اے عزیزو! وہ لمحہ آ ہی گیا۔ مجھے اپنی غلطی کا پھل مل گیا۔ میرا ایک ہاتھ کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ زخم بھرنے تک والیتی نے مجھے اپنا مہمان رکھا اور میرے دل بہلاوے کی باتیں کرتا رہا میں نے خون پسینہ ایک کر کے جو دولت کمائی تھی وہ سب کی سب ضبط کر لی گئی۔ اب میری حالت ایک مفلس کی تھی فلورنس سے میں نے سِسلی کی راہ لی۔ پھر وہاں سے قسطنطنیہ۔ اب میری ساری امیدیں اس رقم پر مرکوز تھیں جو میں نے مغرب کے سفر پر روانگی سے پہلے امانت کے طور پر ایک دوست کے پاس رکھوا دی تھی۔ قسطنطنیہ پہنچ کر میں نے اسے اپنی بپتا سُنائی۔ پھر اس سے گذارش کی کہ چند روز مجھے اپنے ساتھ قیام کرنے دے۔ ابھی میں تنہائی کے

عذاب سے بچنا چاہتا تھا۔ پھر میرے رہنے کا ٹھکانہ کہاں تھا؟ اور ہوتا بھی تو کیا؟ ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا ہوتا تو بھانت بھانت کے واہمے سر میں سمانے لگتے۔ لیکن عزیزو! میرے اسی دوست نے میری گذارش کے جواب میں اُلٹ کر یہ سوال کیا کہ میں خود اپنے گھر میں قیام کے لیے کیوں نہیں جاتا؟ میں بہت حیران ہوا کہ یہ میرا گھر کہاں سے ٹپک پڑا۔ میری حیرانی پر وہ دوست بھی حیران ہوا اور مجھے بتایا کہ کسی شخص نے ملک یونان کی ایک بستی میں میرے نام ایک مکان خریدا تھا اور اس محلّے کے لوگوں کو یہ خبر دی تھی کہ جلدی ہی میں لوٹ کر آجاؤں گا۔ میں اپنے اس دوست کو ساتھ لے کر مکان دیکھنے کے لیے گیا۔ پڑوسی مجھے پہلے ہی جانتے تھے۔ میری خوب آؤ بھگت کی۔ ایک بوڑھے سوداگر نے ایک خط میرے حوالے کیا جو مکان خریدنے والے اجنبی نے میرے لیے چھوڑا تھا۔

خط کی عبارت یوں تھی کہ "اے زالیوکوس! تمھارا ایک ہاتھ ضائع ہوگیا ہے۔ اس لیے اب میرے دو ہاتھ تمھاری خدمت بجا لائیں گے۔ یہ مکان،

مکان کے اندر کا سارا مال اسباب، ساز و سامان سب کچھ تمھارے لیے ہے۔ سال کے سال تمھیں اتنی رقم بھی ملتی رہے گی کہ تم شان سے رئیسوں کی طرح زندگی گزار سکو۔ تم اس شخص کو معاف کر دینا جو تم سے زیادہ بدنصیب اور شکستہ خاطر ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ خط کس کا ہے۔ میرے سوال کے جواب میں اسی سوداگر نے بتایا کہ وہ اجنبی جس نے یہ خط میرے لیے دیا تھا، صورتاً ملک فرانس کا باشندہ نظر آتا تھا اور اس نے ایک سُرخ لبادہ پہن رکھا تھا۔

مکان ستھرا اور کشادہ تھا۔ سامان قیمتی اور رئیسانہ۔ مکان سے ملحق ایک دُکان بھی تھی۔ خوب آراستہ اور دنیا جہان کے سامان سے بھری ہوئی۔ اتنا سامان تو میرے پاس پہلے کبھی نہیں تھا۔

جب سے اب تک دس برس گزر چکے ہیں، آرام اور عزت سے زندگی گزر رہی ہے۔ سفر کا مجھے اب بھی شوق ہے۔ سو اسی شوق کی خاطر کاروبار کو بہانہ بنا کر اب بھی ملکوں ملکوں کی سیر کو جاتا ہوں۔ لیکن اس ملک کی زمین پر میں نے دوبارہ قدم نہیں رکھا جس نے

مجھے اتنا زبردست صدمہ پہنچایا تھا۔ سال کے سال ایک ہزار اشرفیاں میرے پاس اس اجنبی کی طرف سے آجاتی ہیں اس کی سخاوت اور سلوک سے میرے دل کو تقویت ملتی ہے مگر ذہن پر اُداسی کے بادل جوں کے توں چھائے رہتے ہیں۔ معصوم بنا کا چہرہ آنکھوں میں آٹھوں پہر گھومتا رہتا ہے۔ یہ درد میں اپنے ساتھ قبر تک لے جاؤں گا۔"

زالیوکوس نے اپنا قصہ ختم کیا۔ سب کے سب دھیان سے سُن رہے تھے۔ خاص طور پر وہ اجنبی سوار بہت متاثر دکھائی دیتا تھا اور قصہ سنتے وقت کئی بار اس نے آہ بھری تھی اور آنکھوں سے آنسو پونچھے تھے۔ زالیوکوس کے خاموش ہونے پر بہت دیر تک سب اُنھیں واقعات پر گفتگو کرتے رہے۔

سلیم نے سوال کیا: تمھیں اس اجنبی سے نفرت نہیں محسوس ہوتی جس کے ورغلانے پر تم یہ حرکت کر بیٹھے اور اپنا ہاتھ گنوایا؟"

زالیوکوس نے جواب دیا ــــ "برسوں پہلے تک ــــ ایسے لمحے بار بار آتے تھے جب میں خدا سے یہ دُعا مانگتا تھا کہ اس اجنبی پر اپنا عذاب نازل کرے۔ لیکن اب میں

نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے۔ میرا مذہب بھی یہی سکھاتا ہے کہ اپنے دشمن سے بھی نفرت نہ کی جائے۔ اب میں اس کے لیے بھی دُعائے خیر کرتا ہوں۔ وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ دل گرفتہ ہے۔"

"تم کتنے نیک طبیعت انسان ہو!" سلیم نے جذباتی لہجے میں کہا اور محبت سے زالیوکوس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اتنے میں حفاظتی دستے کا کماندار اندر آیا اور یہ تشویشناک خبر لایا کہ اس کے سپاہیوں نے کچھ گھوڑ سوار فاصلے پر دیکھے ہیں جن کا رُخ ہماری ہی طرف ہے۔

سارے سوداگر اس خبر سے پریشان ہو گئے کہ اس مقام پر اکثر قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ البتہ سلیم کو ان کی پریشانی پر کچھ حیرت ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم سب محفوظ رہیں گے اور لٹیرے ہمارا بال بھی بیکا نہ کریں گے۔

یہ سُن کر کماندار بولا ــــ "لٹیرے اگر معمولی قسم کے ہوئے تو ہم محفوظ رہیں گے لیکن ــــ خدانخواستہ اگر اس علاقے کے سب سے بدنام ڈاکو اربذان سے سابقہ پڑ گیا تو مصیبت آجائے گی۔"

"آخر اربذان کی کیا بساط ہے؟ تم سب اس سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟ سلیم نے پوچھا۔"

سب سے بوڑھے سوداگر احمد نے جواب دیا ــ "اربذان کے بارے میں ہزاروں کہانیاں ان علاقوں میں گشت کرتی ہیں۔ کچھ لوگ اسے پُراسرار غیبی قوتوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ وہ اکیلا پانچ جوانوں پر بھاری پڑتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ فرانس کا باشندہ ہے اور اس کی تقدیر اُسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ خیر، کچھ بھی ہو۔ وہ ہے بہت خطرناک!"

"نہیں! ایسا نہیں ہے" ایک اور سوداگر نے

جس کا نام لیزہ تھا، احمد کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "اس میں شک نہیں کہ اربذان ڈاکو ہے لیکن اس میں نیکی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے قبیلے میں لوگ اس کی بہت عزّت کرتے ہیں۔ اربذان ڈاکے نہیں ڈالتا بلکہ قافلے والوں سے اپنا خراج وصول کرتا ہے اور جس نے بھی خراج دے دیا وہ ساتھ خیریت کے آگے کا سفر کرتا ہے۔ اسے اربذان کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ پھر کسی اور کی کیا ہمّت کہ اس قافلے کو تنگ کرے۔ اربذان صحرا کا بادشاہ ہے۔"

سوداگر اپنے خیمے میں بیٹھے اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن باہر محافظ دستے کے لوگ خاصے پریشان تھے۔ مسلح سواروں کا دستہ اور قریب آتا جا رہا تھا۔ جب سوداگروں کو اس کی خبر دی گئی تو ان میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ وہ جم کر آنے والوں سے مقابلہ کریں یا اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیں اور چُپ چاپ بیٹھے رہیں۔ احمد اور دو بوڑھے سوداگر مقابلے کے حق میں نہیں تھے۔ مگر بلیچ اور زالیوکوس، جن کا لہو گرم تھا، آنے والوں سے ٹکر لینے پر آمادہ تھے۔ انھوں نے سلیم کو بھی دعوت

دی کہ ان کے ساتھ وہ بھی باہر جائے اور اپنی شجاعت کا ہاتھ دکھائے۔

سلیم نے جواب میں اپنی کمر پیٹی کے نیچے سے ایک نیلا رومال نکالا جس پر سرخ ستارے کڑھے ہوئے تھے۔ پھر وہ رومال اس عزیز نے ایک نیزے کے سرے پر باندھ دیا اور غلاموں کو ہدایت دی کہ نیزہ لے جا کر خیمے کے باہر گاڑ دیں۔ اس نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا کہ آنے والے سوار جب رومال لہراتے ہوئے نیزے کو دیکھیں گے تو چپ چاپ کسی اور سمت نکل جائیں گے۔ حملے کی خاطر ہرگز نہ آئیں گے۔ کچھ کو اس بات پر یقین آیا، کچھ کو یہ بات خالی خولی ڈینگ لگی۔ سب آنے والے لمحے کے منتظر تھے۔ پھر وہی ہوا جس کا سلیم نے یقین دلایا تھا۔ مسلح سواروں نے جونہی خیمے سے باہر گڑے نیزے اور اس پر لہراتے رومال کی جانب دیکھا دُم دبائے آگے بڑھ گئے۔

سوداگروں کو جانے والوں پر بھی حیرانی ہوئی اور سلیم پر بھی۔ سلیم خاموش کھڑا تھا۔ گویا کہ کوئی خاص بات ہی نہیں۔ اس کی نگاہ دور افق پر جمی ہوئی تھی۔ آخر کو لیج نے خاموشی توڑی اور یوں گویا ہوا:

"اے اجنبی! تم کون ہو؟ یہ کیا اسرار ہے؟"

"یار رفقا!" سلیم نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں کیا بھید ہے، خود مجھے معلوم نہیں۔ میں نے یہ رومال اپنی قید کے دوران حاصل کیا تھا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ اگر کوئی اس نشان کے ساتھ سفر کرے تو ہر خطرے سے محفوظ رہتا ہے۔"

سوداگروں نے سلیم کا شکریہ ادا کیا۔ مسلح سوداگروں کا دستہ اتنے افراد پر مشتمل تھا کہ اگر وہ حملہ کر بیٹھتے تو جان بچانا محال ہو جاتا۔ یہ خطرہ ٹلنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے تھے، اور اب ہر فکر سے ان کا ذہن آزاد تھا۔ ہوا میں اب خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ شام دھیرے دھیرے گہری ہوتی جاتی تھی۔ صحرا پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ وہ آگے سفر پر چل پڑے۔

اگلے روز جب انھوں نے ایک نئی منزل پر پڑاؤ ڈالا تو انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اب صحرا کا سفر بس ایک دن کا اور رہ گیا ہے۔ کھا پی کر سب ایک جگہ بیٹھے تو لیزہ نے کہا:

"عزیزو! کل میں نے کہا تھا کہ اربذان ایک بھلا آدمی ہے۔ اس کے ثبوت میں کچھ واقعات سناتا ہوں

جو میرے بھائی کو پیش آئے تھے۔
سب کے سب لیزہ کے قریب سمٹ آئے اور
اس کی آواز پر کان لگا دیے۔ لیزہ نے ایک لمحے کے

توقف کے بعد ان واقعات کا بیان اس طرح شروع
کیا ــــ "اقرہ کے مقام پر ہمارا خاندان رہتا تھا۔
میرے والد قاضی تھے۔ ان کے تین اولادیں تھیں۔ ان
میں سب سے بڑا میں تھا۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا
اور ایک بہن۔ جب میں نے عمر کے بیس برس پورے
کیے تو ایک روز میرے چچا نے مجھے بلایا اور بتایا کہ
انھوں نے اپنی تمام املاک اور جائداد کا وارث مجھے
مقرر کر دیا ہے۔ بس ایک شرط ہے۔ یہ کہ جب تک وہ
زندہ رہیں میں انھیں کے ساتھ قیام کروں۔ میرے چچا
نے ایک لمبی عمر پائی۔ سو اپنے گھر میں بس دو ہی برس
پہلے واپس آیا ہوں۔ گھر آنے تک مجھے کچھ خبر اس
بات کی نہ ہو سکی تھی کہ میری عدم موجودگی میں ہمارے
خاندان پر کیا مصیبتیں آئیں اور خدائے بزرگ و برتر
نے بالآخر کس طرح مصیبتوں کے اس جال سے میرے
خاندان کو نجات دلائی۔ عزیزو! اللہ بڑا کارساز ہے
اور قدرت کے کارخانے میں کسی اور کی کیا مجال کہ ایک
پتہ بھی بغیر اس کے حکم کے ہل سکے۔ سو اے عزیزو!
سنو اور غور کرو ــــ"

فاطمہ کی کہانی

میرے بھائی مصطفیٰ اور بہن فاطمہ کی عمروں میں تھوڑا ہی فرق تھا، بس دو برس کا۔ مصطفیٰ سے فاطمہ دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے تھے۔ والد انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ جب فاطمہ سولہ برس کی عمر کو پہنچی تو مصطفیٰ نے اُس کی سالگرہ کا جشن منانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے فاطمہ کی تمام سہیلیوں کو دعوت نامے بھیجے اور والد کی حویلی کے باغ میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ شام کو کشتی پر دریا کی سیر کا اہتمام کیا گیا۔

فاطمہ اور اس کی سہیلیاں بے حد خوش تھیں۔

وہ شام بہت خوش گوار تھی۔ سمندر کے ساحل سے شہر کا منظر بے حد حسین تھا۔ لڑکیاں آپس میں خوب چہلیں کر رہی تھیں۔ انھوں نے مصطفیٰ سے فرمایش کی کہ سیر ذرا لمبی ہونی چاہیے۔ مصطفیٰ نے قدرے جھجک کے ساتھ اُن کی بات مانی کیونکہ چند روز قبل ہی سمندر میں بحری قزاقوں کا ایک جہاز نظر آیا تھا۔

لڑکیوں کے اصرار پر کشتی کنارے سے ذرا فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اتنے میں تھوڑی ہی دُور پر ایک اور کشتی دکھائی دی۔

اس پر مسلح جوان سوار تھے۔ مصطفیٰ نے فوراً خطرے کی بُو سونگھ لی اور کشتی بانوں کو حکم دیا کہ فوراً اس کا رُخ ساحل کی طرف موڑ لیں اور جتنی جلد ممکن ہو وہاں سے نکل چلیں۔ لیکن دوسری کشتی والے بھی چوکنے تھے۔ انھوں نے تعاقب کیا اور آن کی آن میں قریب آپہنچے۔

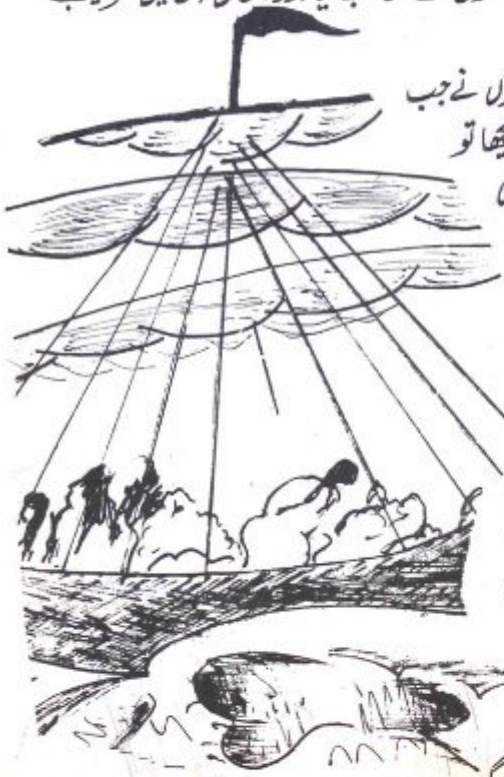

لڑکیوں نے جب خطرہ سر پہ دیکھا تو گریہ وزاری کرنے لگیں۔ مصطفیٰ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ سب کی سب حواس کھو بیٹھیں اور کشتی اُلٹ گئی تو سب کے سب ان سے جائیں گے۔

لیکن ہر فہمایش بیکار ثابت ہوئی۔ جیسے ہی مسلح جوانوں کی بڑی سی کشتی کچھ اور نزدیک آئی لڑکیاں سہم کر ایک دوسرے سے چمٹ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی اُلٹ گئی۔ ٹھیک اسی وقت ساحل پر ایک عجیب وغریب جہاز دکھائی دیا۔ شاید اس جہاز پر جو لوگ سوار تھے اُن کی نظر ان لوگوں پر پڑ گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی کئی کشتیاں لڑکیوں کو بچانے کے لیے جہاز والوں نے روانہ کر دیں۔ پل بھر میں وہ کشتیاں اس مقام پر آپہنچیں اور ڈوبتی ہوئی لڑکیوں کو بچا لیا گیا۔ اے رفیقو! قیامت کا سماں تھا۔ کسی کے حواس قابو میں نہ تھے۔ جب لڑکیوں کا شمار کیا گیا تو پتا چلا کہ میری بہن فاطمہ اور اس کی ایک سہیلی لاپتہ ہیں۔ مسلح جوانوں کی کشتی بھی غائب ہو چکی تھی اور دُور دُور اس کا سراغ نہ ملتا تھا ایک اجنبی بھی انھیں لڑکیوں کے پیچھے دکھائی دیا۔ مصطفیٰ نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو اس ناہنجار نے یہ بات قبول کی کہ وہ لٹیروں کا ساتھی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے ساتھی دو لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

میرے والد کو سخت صدمہ پہنچا۔ ڈر تھا کہ کہیں اس صدمے کے اثر سے جاں بحق نہ ہو جائیں۔ ادھر مصطفیٰ کی حالت خراب تھی۔ ایک تو بہن کے کھو جانے کا غم، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی نگرانی میں

یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اپنے آپ پر اسے شرم آتی تھی۔ فاطمہ کی جو سہیلی اس کے ساتھ غائب ہوئی تھی وہ مصطفےٰ کو بہت عزیز تھی۔ سو اس کا دُکھ دوگنا تھا۔ گرچہ یہ بات اس نے اب تک خاندان کے تمام لوگوں سے چھپائی تھی اور اے عزیزو! اس کا سبب یہ تھا کہ وہ لڑکی ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور ہماری حیثیت کی نہ تھی۔ ہمارے والد سخت گیر آدمی تھے۔ اس رشتے پر کبھی بھی رضامند نہ ہوئے۔

اس سانحے کے چند روز بعد والد نے مصطفےٰ کو بلایا۔

چند لمحوں تک کڑی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر برس پڑے ——— "نالائق! تمھاری ہی غیر ذمے داری نے یہ دن دکھایا ہے۔ میری آنکھوں کا نور، دل کا چین چلا گیا۔ آہ! میری پیاری دختر خدا جانے کس حال میں ہوگی۔ جاؤ! چلے جاؤ! اب اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔ میں تمھیں بد دُعا دیتا ہوں کہ جیسی تکلیف اس بڑھاپے میں تمھاری حماقت سے مجھ کو پہنچی ہے اس سے سوا تکلیف تم کو پہنچے۔ تم پر لعنت ہو!"

میرے غریب بھائی کو والد سے اتنی سختی کی توقع نہ تھی۔ اس نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ فاطمہ کی تلاش میں جائے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ کر لائے گا۔ لیکن ——— والد نے تو اسے گھر سے ہی نکال دیا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر ——— اس نے یہ عہد کیا کہ جیسے بھی ہو سکا وہ دونوں لڑکیوں کو واپس لا کر دم لے گا۔

وہ اس لٹیرے کے پاس گیا جسے قید کر لیا گیا تھا اور اس سے پوچھا کہ لٹیروں کے جہاز کو کس طرف تلاش کیا جائے۔ پتا چلا کہ وہ لٹیرے غلاموں اور کنیزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور عام طور پر بلزورا کے ساحلی شہر میں جو بڑا بازار لگتا تھا، اس میں وہ غلاموں اور کنیزوں کو فروخت کرتے تھے۔

مصطفےٰ نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ والد کا غصہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ سو انھوں نے مصطفےٰ کو اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی دی۔ مصطفےٰ نے بہ چشمِ نم سب سے رخصت لی اور اپنی مہم پر نکل گیا۔

اس نے خشکی کا سفر اختیار کیا کیونکہ ہمارے شہر سے بلزورا تک کوئی جہاز جاتا نہ تھا۔

وہ روزانہ خاصی لمبی مسافت طے کرتا۔ اس کا گھوڑا قوی اور جی دار تھا۔ پھر اس نے سامان بھی بہت ہلکا ساتھ لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ چھٹے دن کے خاتمے تک وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

لیکن سفر کے چوتھے دن، وہ ایک سنسان راستے سے گزر رہا تھا کہ تین آدمی ہتھیاروں سے لیس اور خونخوار صورتوں والے اچانک کہیں سے نمودار ہوئے اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ مصطفےٰ نے ناچار گھوڑا اور اشرفیوں کی تھیلی اُن کے حوالے کر دی۔ ان ظالموں نے اسی پر بس نہ کیا۔ انھوں نے مصطفےٰ کو گھوڑے کے پیٹ

کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا اور اسے لے کر چمپت ہو گئے۔ مصطفےٰ کی فریادوں کا ان سنگ دلوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

اب کیا امید باقی رہ گئی تھی؟ مصطفےٰ کو دُنیا تاریک نظر آنے لگی۔ تن بہ تقدیر وہ اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گھنٹے بھر بعد وہ لوگ ایک تنگ وادی میں داخل ہوئے۔ وادی کے دونوں طرف قد آور درخت تھے۔ نیچے ہری ملائم گھاس۔ پاس ہی ایک تیز رو چشمہ تھا۔ اس راہ سے گزرنے والے آدمی جانور سبھی اس چشمے کے پانی سے پیاس بجھاتے اور گھڑی دو گھڑی وہاں قیام کرتے۔ ان ظالموں نے بھی اس پر فضا مقام پر پہنچتے ہی گھوڑوں کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور اُتر پڑے۔ آس پاس کچھ خیمے نصب تھے۔ ایک خیمے سے بیک وقت دو گانے والوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ کوئی دَف بھی بجاتا جا رہا تھا۔ ان ظالموں نے مصطفےٰ پر رحم کیا اور اس کے بدن سے رسّی کھول دی۔ پھر اسے حکم دیا کہ سب سے بڑے خیمے میں داخل ہو جائے۔

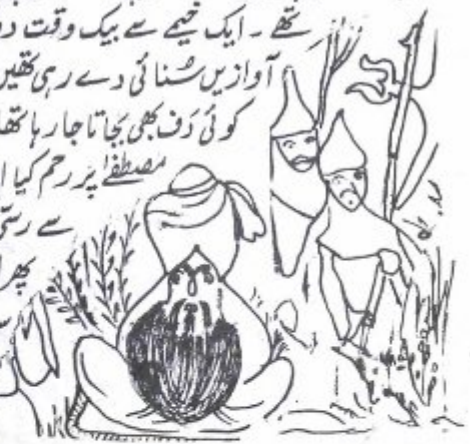

خیمے کے اندر کے منظر کا حال کیا بتاؤں؟ بس یہ سمجھ لو کہ کسی رئیس ابن رئیس ابن رئیس کا دیوان خانہ نظر آتا تھا۔ منقش اور مزین مسندیں اور بیش قیمت قالین، سونے چاندی کے ظروف۔ ایک پستہ قامت بوڑھا بیٹھا تھا۔ کالی، مٹیالی جلد، کینہ توز آنکھیں اور سخت گیر دہانہ۔ وہ مردود بوڑھا چہرے سے کم ذات لگتا تھا اور اسے دیکھ کر کسی کو بھی اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگتی کہ اس کے اردگرد جو قسم قسم کی قیمتی چیزیں بکھری تھیں وہ صرف لوٹ مار کے نتیجے میں ہاتھ آئی ہوں گی۔

اس نے چہرے پر مصنوعی رعب طاری کرتے ہوئے کھنکھناتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "بیٹھ جاؤ!"

اجنبی نے جو مصطفےٰ کو ساتھ لے کر خیمے میں داخل ہوا تھا، لاپروائی کے انداز میں سوال کیا ـــــ "سردار کہاں ہے؟"

"شکار پر گیا ہوا ہے!" بوڑھے نے جواب دیا۔ پھر بولا ـــــ "اس وقت میں ہی اس کا نائب ہوں!"

"ہوں!" اجنبی نے پرخیال انداز میں کہا ـــــ "اب یہ طے کرنا ہے کہ اس کتے کو جان سے مار دیا جائے یا نہیں۔ سردار ہی فیصلہ کرے گا سمجھے میاں حسن!" اتنا کہہ کر وہ بوڑھے کی طرف تمسخر آمیز انداز میں دیکھنے لگا۔

بوڑھا غصے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے لپک کر اجنبی کے کان کھینچنے چاہے لیکن اجنبی سرو قامت تھا اور بوڑھا پستہ قد اس لیے اجنبی کے کان اس کی دست رس سے محفوظ رہے۔ اجنبی ہنسنے لگا۔ بوڑھے پر جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی اور وہ مغلظات بکنے لگا۔

اچانک خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک لمبا تڑنگا نوجوان خوبرو اور پرشکوہ اندر آیا۔ صورت سے عجمی شہزادہ لگتا تھا۔ اس کا لباس اور اسلحے معمولی تھے۔ بس خنجر بہت قیمتی دکھائی دیتا تھا۔ دستے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ لیکن انداز و اطوار شاہانہ تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میرے خیمے میں تمھاری یہ مجال!" اس نے گرج کر کہا۔

بوڑھا کانپ گیا۔ لمحے بھر کے لیے خیمے میں سناٹا چھا گیا۔

"حسن! میں نے تمھیں نائب مقرر کیا تھا! کیوں؟" نوجوان نے غصیلی نظروں سے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

بوڑھے نے بزدلوں کے انداز میں سر جھکا لیا۔ اس کا قد کچھ اور کم دکھائی دینے لگا۔ پھر نوجوان نے اسے ایک لات رسید کی اور لڑھک کر وہ خیمے کے باہر جا پڑا۔

اب اس اجنبی نے نوجوان کو مخاطب کیا ـــــ "سردار! یہ قیدی تمھارے حکم پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حاضر ہے!"

نوجوان نے سر سے پیر تک مصطفےٰ پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالی اور کہا ـــــ "پاشا! تمھیں معلوم ہے کہ تم کس لیے اربذان کے سامنے لائے گئے ہو!"

"اربذان" کا نام سنتے ہی مصطفےٰ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ اس کے قدموں میں گر پڑا اور گریہ کرنے لگا۔

"میں نہ پاشا ہوں نہ شہزادہ! میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ ایک بدنصیب آدمی!" مصطفےٰ نے گڑگڑا کر کہا۔

اربذان کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ آنکھوں سے بے یقینی جھلکنے لگی۔ پل۔ کو وہ چپ رہا۔ پھر کڑک کر بولا ـــــ "جھوٹ بولنے سے کام نہیں چلے گا سمجھے؟ میں کسی ایسے شخص کو لاؤں گا جو تمھیں پہچانتا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ ایک خادم اندر آیا۔ نوجوان نے اسے حکم دیا کہ زلیما کو حاضر کرے۔ چند لمحوں بعد ایک بڑھیا بھوس اندر آئی۔

اربذان نے میرے بھائی کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا ـــــ "یہی سلیج کا پاشا ہے؟" اس کمبخت بڑھیا نے منمنا کر جواب دیا ـــــ "ہاں یہی ہے!"

اس پر اربذان چیخ پڑا ـــــ "جھوٹے! فریبی! تم سمجھ رہے تھے کہ اس طرح آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ نکلو گے؟

تم اتنے غلیظ ہو کہ میں اپنے خنجر کی نوک پر تمھارے لہو کی بوند دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا! کل صبح تمھیں رسیوں میں جکڑ کر گھوڑے کی دُم سے لٹکا دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد تمھیں اس وقت تک جنگل میں گھسیٹا جائے گا جب تک کہ سلیج کی پہاڑیوں کے پیچھے سورج غروب نہ ہو جائے۔"

میرے بھائی کا خون خشک ہو گیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا ـــــ "یہ سب میرے والد کی بددعاؤں کا اثر ہے۔ میرے خدا! یہ کن گناہوں کی سزا ہے!"

"تم میرے سامنے فرضی کہانیاں نہ سناؤ! سمجھے!" اربذان بولا۔

اس اجنبی نے جو چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا، دھیرے سے کہا ـــــ "سردار کے قہر سے ڈرو! جاؤ اور اگر چاہو تو رات عبادت میں گزار دو! جاؤ، باہر نکلو!"

مصطفےٰ کے قدم دروازے کی طرف اُٹھے ہی تھے کہ سردار کے گروہ کے تین اور افراد ایک قیدی کو ساتھ لیے اندر آئے۔ ایک نے پرجوش انداز میں کہا "سردار! یہ لو پاشا حاضر ہے!"

میرے بھائی نے ٹھٹک کر اس قیدی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دونوں کی صورتیں تقریباً

ایک جیسی تھیں۔ بس اتنا فرق تھا کہ اس قیدی کی جلد کا رنگ قدرے سانولا تھا اور مصطفٰے کی داڑھی اس کے مقابلے میں زیادہ سیاہ اور چمکیلی تھی، اربذان بھی دونوں کی مماثلت پر حیران ہوا۔

"تم دونوں میں اصل آدمی کون ہے، میرا مطلب ہے سلیج کا پاشا؟" اربذان نے یکے بعد دیگرے دونوں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ہوں!" قیدی نے پرغرور انداز میں جواب دیا۔

اربذان نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا پھر محافظوں کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائیں۔ اس کے بعد وہ میرے بھائی کی طرف مڑا۔ اپنے خنجر سے اس کی رسیاں کاٹیں۔ پھر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"اجنبی!" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ محض غلط فہمی کی بنا پر تمھیں یہ زحمت اٹھانی پڑی۔ اسے تقدیر کا کھیل سمجھو اور عفو سے کام لو۔"

میرے بھائی نے بس یہ درخواست کی کہ اسے اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اربذان نے اس جلد بازی کا سبب پوچھا۔ مصطفٰے نے ساری بپتا کہہ سنائی۔ اس پر اربذان نے اصرار کیا کہ

وہ ایک رات اس کا مہمان رہے اور آرام کرے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے بلزورا کا ایک نسبتاً مختصر راستہ بتائے گا۔ میرے بھائی نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اربذان نے اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ عمدہ کھانے تیار کروائے۔ آرام دہ بستر لگوا دیا۔ وہ رات مصطفٰے نے بہت آرام سے گزاری اور جی بھر کے اچھی گہری نیند کے مزے لیے۔

"آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ خیمے میں وہ اکیلا ہے۔ پردے کے دوسری طرف سے اربذان اور حسن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ ذرا دیر سنتا رہا۔ حسن اربذان سے اصرار کر رہا تھا کہ اس اجنبی کو، جو گرفتار کر کے لایا گیا ہے، جان سے مار دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بعد میں خطرناک ثابت ہو۔"

یہ طے تھا کہ حسن کو مصطفٰے سے ایک قسم کی ذاتی پرخاش ہو گئی تھی۔ مصطفٰے ہی کی وجہ سے اسے اتنی رسوائی اٹھانی پڑی تھی۔

میرے بھائی کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون پل بھر کے لیے جم سا گیا۔ پھر اربذان کی آواز گونجی اور اس کی جان میں جان آئی۔ اربذان کہہ رہا تھا۔ "نہیں! یہ اجنبی ہمارا مہمان ہے۔ اور مہمان کی جان لینا اربذان کے اصول کے خلاف ہے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ اس سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔"

چند لمحوں بعد اربذان خیمے میں داخل ہوا اور نرم لہجے میں

کہا: "کیوں مصطفیٰ! کیسے ہو تم؟ ہم اب سفر کے لیے تازہ دم ہو جائیں!"

اس نے مصطفیٰ کی طرف شربت کا ایک گلاس بڑھایا۔ شربت ختم کرنے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ رکاب پر پاؤں رکھتے ہی مصطفیٰ کے حوصلے اونچے ہو گئے۔ دونوں نے ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ سامنے گھنا جنگل تھا اور اس کے بیچوں بیچ ایک صاف ستھرا چوڑا راستہ۔ سفر کے دوران ارہان نے مصطفیٰ کو بتلایا کہ سلیج کے پاشا نے کس طرح اس کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ پہلے تو اس نے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے آدمیوں کی نقل و حرکت پر معترض نہ ہوگا۔ لیکن پھر اس کے ایک آدمی کو گرفتار کر کے اذیتیں دیں اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب سے اب تک ارہان کے آدمی پاشا کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور موقعے کی تاک میں تھے۔ اب وہ ہاتھ آ گیا تھا اور ارہان کے ہاتھوں اس کی موت یقینی تھی۔

جنگل کے شرقی کنارے پر پہنچنے کے بعد ارہان نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ مصطفیٰ کو آگے کا راستہ سمجھایا اور خدا حافظ کہنے سے پہلے یوں گویا ہوا: "اے مصطفیٰ! تم عجیب و غریب حالات میں ارہان کے مہمان بنے۔ تم نے ناحق اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ خنجر میں تمھیں اپنی نشانی

کے طور پر دیتا ہوں۔ جب کبھی تم پر کوئی بُرا وقت پڑے تم یہ خنجر کسی طرح مجھ تک بھیج دینا۔ میں تمھاری مدد کو آ جاؤں گا۔ اور اشرفیوں کی یہ تھیلی بھی سنبھالو! یہ تمھارے سفر کے اخراجات کے لیے ہے۔"

میرے بھائی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے خنجر تو لے لیا لیکن اشرفیوں کی تھیلی اسے واپس کرنی چاہی۔ ارہان نے مزید اصرار کیا۔ پھر وہ تھیلی وہیں چھوڑ کر رفو چکر ہو گیا۔ مصطفیٰ نے بالآخر وہ تھیلی اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بلزورا کی جانب روانہ ہو گیا۔

کہانی کے اس موڑ پر پہنچ کر لیزہ نے پل بھر کو خموشی اختیار کی اور سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھا۔ احمد نے کہا "اگر یہ صحیح ہے تو میں ارہان کے سلسلے میں اپنی رائے بدل لیتا ہوں! وہ تو واقعی بھلا آدمی ہے اور تمھارے بھائی کے ساتھ اس نے بڑی نیکی کا سلوک کیا ہے۔"

—— سلیج نے کہا: اس کا برتاؤ ایک سچے مسلمان کا برتاؤ ہے۔ خیر! اب آگے کا احوال سناؤ۔"

لیزہ نے جواب دیا —— "اگر آپ لوگ اکتا نہیں گئے ہیں تو میں باقی قصہ بھی سناؤں گا۔ یہ واردات بہت انوکھی اور دلچسپ ہے۔"

سب نے لیزہ کی آواز پر کان لگا دیے اور لیزہ نے آگے کے واقعے کا بیان شروع کیا:

"گھر چھوڑنے کے ساتویں دن کی صبح کو مصطفےٰ بلزورا کی فصیل کے سامنے تھا۔ ایک سرائے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا۔ ایک راہ گیر سے دریافت کیا کہ غلاموں کا بازار وہاں کس روز لگتا ہے، اور اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ وہ دو دن دیر سے وہاں پہنچا تھا۔ راہ گیر نے اسے پچھلے بازار کا احوال سُنایا اور بتایا کہ دو بہت خوبصورت کنیزیں اُس روز فروخت ہوئیں۔ تفصیلات معلوم ہونے پر مصطفےٰ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کنیزیں فاطمہ اور اس کی سہیلی زریدہ تھیں جس شخص نے انھیں خریدا اس کا نام سیولیکوس تھا اور بلزورا سے اس کے وطن کا راستہ کم از کم چالیس گھنٹوں کا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا صاحبِ حیثیت شخص تھا اور اب کافی روپیا پیسہ جمع کرنے کے بعد چین کی زندگی گزار رہا تھا۔

مصطفےٰ نے پہلے تو یہ ارادہ کیا کہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ اسی وقت سیولیکوس کے وطن کی راہ لے۔ پھر اسے خیال آیا کہ تنِ تنہا اتنے صاحبِ حیثیت شخص سے نبٹنا اس کے بس کی بات نہ ہو گی۔ کافی غور و خوض کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ——— یہ کہ وہ سلیج کے پاشا کی حیثیت

میں اس سے ملے۔ مصطفےٰ نے اپنے بالوں اور داڑھی پر سلیج کے پاشا کے بالوں جیسی رنگت والا خضاب لگایا۔ ایک جڑی بوٹی پیس کر اس کا لیپ بنایا اور چہرے پر ملا۔ اب اس کی جلد کا رنگ کچھ گندمی ہو گیا تھا اور وہ عین مین سلیج کا پاشا لگتا تھا۔ اس نے ایک خدمت گار سیولیکوس کے محل کی طرف روانہ کیا، اس پیغام کے ساتھ کہ وہ ایک رات اس کے گھر قیام کا طالب ہے۔ سیولیکوس نے غلاموں کا ایک پورا دستہ اس کے خیر مقدم کے لیے بھیج دیا۔ وہ بڑے اکرام کے ساتھ مصطفےٰ کو اپنے ساتھ لے گئے۔

سیولیکوس نے مصطفےٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی عزت سے پیش آیا۔ خوب عمدہ عمدہ کھانوں سے اس کی تواضع کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد گفتگو کا سلسلہ چل نکلا اور باتوں باتوں میں سیولیکوس اپنی نئی کنیزوں کا تذکرہ کر بیٹھا۔ سیولیکوس نے بتایا کہ دونوں کنیزیں انتہائی حسین مگر اتنی ہی خود سر بھی ہیں اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ مصطفےٰ کو اپنے منصوبے میں کامیابی کی خاصی امید پیدا ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد سیولیکوس نے اس سے اجازت چاہی اور سونے کے لیے محل کے اندر چلا گیا۔

مصطفےٰ کو بھی نیند آ گئی۔ مگر ابھی مشکل سے ایک گھنٹا

سویا ہوگا کہ اسے اپنے قریب تیز روشنی سی محسوس ہوئی اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سامنے حسن کو کھڑا ہوا پایا۔ اسے گمان گزرا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنے بازو میں زور کی چٹکی لی، اور پھر اسے یقین آگیا کہ وہ جاگ رہا ہے۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے گرج کر سوال کیا۔

"سرکار خدمت ہوں!" حسن نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں تو آپ کا پُرانا خادم ہوں! میری ایک درخواست ہے!"

"کیا؟ جلدی کہو؟ تم یہاں کیسے آپہنچے؟"

"میں نے اربذان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔" حسن نے جواب دیا۔ "ہمارے اختلاف کا سبب تم ہی ہو۔ سمجھے! اب اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دو گے تو میں اس کی رہائی میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر نہیں تو پھر میں اپنے نئے مالک کے سامنے جا کر تمھارا بھانڈا ابھی پھوڑ دوں گا!"

مصطفےٰ کا خون کھول اُٹھا۔ اب جبکہ اس کا منصوبہ کامیاب ہوتا ہوا نظر آتا تھا، بیچ میں یہ نیا فتنہ پیدا ہوگیا۔ اب

صرف ایک صورت تھی ـــــ یہ کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مصطفےٰ نے ایک جست لگائی اور اس پر آرہا۔ حسن کے ہاتھ سے چراغ فرش پر گرا اور بھڑک کر گل ہوگیا۔ اس نے پوری قوت سے ایک چیخ بلند کی۔

مصطفےٰ کے حواس جواب دے گئے۔ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اب اسے اپنی ہی حفاظت کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے لپک کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی کہ فرار کا راستہ لے۔ لیکن کھڑکی زمین سے بہت اونچائی پر تھی۔ پھر اس کے باہر صحن کی دیواریں بھی خاصی اونچی تھیں۔ دروازے کے باہر سے کچھ آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مصطفےٰ نے اپنا خنجر نکال لیا، اپنے کپڑے سمیٹے اور ہمّت کر کے کھڑکی سے کود گیا۔ فرش پر پہنچتے ہی وہ دیوار کی طرف بھاگا اور بڑی تیزی کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ پھر اس نے دوسری طرف چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد بھی اس نے دم نہ لیا۔ وہ بھاگتا گیا، بھاگتا گیا، اور ایک جنگل کے قریب جا پہنچا۔ اب وہ بُری طرح تھک چکا تھا۔ نڈھال ہو کر وہ فرش پر گر پڑا۔

کچھ دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے۔ اب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو؟ اُس کا گھوڑا اور خدمت گار سیولیکوس کے محل ہی میں رہ گئے تھے۔ لیکن وہ

جو کہتے ہیں کہ مصیبت آن پڑے تو دماغ بھی خوب تیزی سے چلنے لگتا ہے، مصطفٰے کا ذہن بھی بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے جنگل کے اندر جانے والا راستہ اختیار کیا۔ اور چلتے چلتے ایک گاؤں تک جا پہنچا۔ یہاں اس نے ایک گھوڑا خریدا اور پھر قصباتی آبادی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے کسی اچھے طبیب کا پتا دریافت کیا۔ لوگوں نے ایک تجربہ کار طبیب کے گھر کا راستہ دکھا دیا۔ طبیب سے مصطفٰے نے ایک ایسی دوا طلب کی جو انسان کو موت جیسی گہری نیند سلا دے، اس کے ساتھ ساتھ ایک اور دوا ایسی بھی جو اس نیند کا توڑ کرتی ہو۔ پھر اس نے ایک مصنوعی داڑھی، ایک سیاہ لبادہ، کچھ صندوق صندوقچے، کچھ چھوٹی بڑی بوتلیں خریدیں۔ یہ سارا سامان ایک گدھے کی پیٹھ پر لادا اور واپس سیولیکوس کے محل کو چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ نئے بہروپ میں اسے کوئی بھی پہچان نہ سکے گا۔

اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے خود کو ایک طبیب کہہ کر لوگوں سے متعارف کرایا۔ اپنا نام شکامنکا بودی بابا بتایا۔ سوچ سمجھ کر آگے کا منصوبہ بنایا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت سیولیکوس کے کانوں تک پہنچی۔ اس کے عجیب و غریب نام نے سیولیکوس کو فوراً متوجہ کر لیا اور اس نے اپنے ملازم خاص کو حکم دیا کہ جا کر

بابا کو اپنے ساتھ لائے۔ پھر تمام کنیزوں کا اس سے معائنہ کرائے۔ مصطفٰے کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا کہ اس طرح اسے ایک بار پھر اپنی بہن کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔

سیولیکوس نے کہا: "بابا! دیکھو! سامنے کی دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ ایک ایک کر کے تمام کنیزیں اس سوراخ سے اپنا ہاتھ باہر نکالیں گی اور تم ان کی نبض دیکھو گے!"

مصطفٰے نے نبض دیکھنے کے بجائے دو بدو ان کنیزوں کو دیکھنے پر زور دیا۔ مگر سیولیکوس نے ایک نہ مانی۔ بس اس پر رضامند ہو گیا کہ وہ سب کے بارے میں تفصیلات بھی بتاتا جائے گا۔

پھر اس نے ایک لمبی فہرست ہاتھ میں لی اور ایک ایک کر کے کنیزوں کے نام پکارنے لگا۔ ہر صدا پر ایک کنیز اپنا ہاتھ سوراخ سے باہر نکال دیتی۔ ساتواں نام فاطمہ کا تھا۔ ایک ننھا سا گورا ہاتھ باہر نکلا۔ مصطفٰے نے خوشی سے کانپتے ہوئے اس کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور کہا ——"یہ لڑکی بیمار ہے!" سیولیکوس نے حکم دیا کہ اس کے لیے فوراً دوا تیار کرائی جائے۔ مصطفٰے کمرے سے باہر نکل آیا اور جلدی جلدی کاغذ کے ایک پرزے پر یہ عبارت تحریر کی۔

"فاطمہ! میں یہاں تمہیں چھٹکارا دلانے کے لیے آیا ہوں۔

مجھے کامیابی اسی صورت میں ہوگی جب تم میری تجویز کی ہوئی دوا کھالو۔ اس کے اثر سے تم بظاہر بے جان ہو جاؤ گی۔ مگر ڈرومت! میرے پاس اس دوا کا توڑ بھی ہے۔ اگر تم رضامند ہو تو بس یہ کہلا دینا کہ دوا کا تم پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ میں تمھارا اشارہ سمجھ جاؤں گا۔"

مصطفیٰ نے ایک بار پھر فاطمہ کی نبض دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اس بہانے وہ کاغذ سے تھما دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے دوا بھی دیدی۔ سیولیکوس فاطمہ کی طرف سے بہت متفکر تھا۔ چنانچہ اس نے بقیہ کنیزوں کا معائنہ دوسرے دن پر ٹال دیا اور مصطفیٰ سے کہا:

"اے معالج! مجھے صاف صاف بتاؤ فاطمہ کی بیماری کیا ہے؟"

مصطفیٰ نے ایک لمبا سانس لیا پھر کہا: "حضور! خدا تم پر رحم کرے! یہ کنیز ایک جان لیوا بخار میں مبتلا ہے۔"

سیولیکوس یہ سن کر بھڑک اٹھا۔ چیخ کر بولا ——— "تم معالج ہو کہ گدھے! میں نے اس پر دو ہزار اشرفیاں خرچ کی ہیں۔ اگر تم اس کا علاج نہیں کر سکے تو تمھاری جان کی خیر نہیں ہے۔"

اب مصطفیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے

سیولیکوس کو دلاسہ دیا۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک حبشی غلام اندر آیا اور بتایا کہ فاطمہ پر اس دوا کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔

سیولیکوس نے درد بھری آواز میں کہا ——— "تم اس کے علاج پر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دو! منھ مانگا انعام ملے گا۔"

"انشاء اللہ" مصطفیٰ کی حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

اندر جا کر مصطفیٰ نے وہی نیند والی دوا نکالی۔ پھر غلام کے حوالے کی۔ اس کے بعد اس نے سیولیکوس سے کہا کہ اسے چند مخصوص بوٹیوں کی تلاش ہے جو جھیل کے کنارے اُگتی ہیں۔ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جھیل کے پاس پہنچ کر اپنا لبادہ اور داڑھی پانی میں پھینک دی اور خود جھاڑیوں کے پیچھے جا چھپا۔ ذرا دیر بعد اندھیرا پھیل گیا۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔

اس دوران میں، مصطفیٰ کی روانگی کے تقریباً گھنٹے بھر بعد سیولیکوس تک یہ خبر پہنچی کہ فاطمہ مرنے کے قریب ہے۔ اس نے فوراً غلاموں کو حکم دیا کہ اس

منحوس طبیب کو ڈھونڈ کر لائیں۔ کافی چھان بین کے بعد غلاموں نے اسے یہ اطلاع دی کہ بوڑھا طبیب جھیل میں ڈوب گیا۔ اس کا لبادہ پانی کی سطح پر تیر رہا ہے۔ اب سیولیکوس نے گریہ وزاری شروع کر دی۔ فاطمہ پر موت کی نیند اچھی طرح طاری ہو چکی تھی اور سبھی اسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ سیولیکوس نے تابوت کی تیاری کا حکم دیا اور فاطمہ کی تدفین کی تیاریاں ہونے لگیں ــــ

ــــ ابھی تابوت بردار قبرستان تک پہنچے ہی تھے اور فاطمہ کا تابوت زمین پر رکھا ہی تھا کہ درختوں کے پیچھے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ قبرستان کی خاموشی میں یہ آوازیں بہت ڈراونی محسوس ہوئیں۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آوازیں کچھ اور تیز ہوتی گئیں اور ان کا ڈر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بدحواس ہو کر وہ بھاگ نکلے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو مصطفٰے درختوں کے جھنڈ سے باہر آیا اور اپنا چراغ روشن کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آوازیں مصطفٰے ہی کی تھیں۔ اب مصطفٰے نے ایک ننھی سی بوتل نکالی جس میں فاطمہ کو دوبارہ ہوش میں لانے کی دوا بھری ہوئی تھی۔ اس نے تابوت کا ڈھکنا اوپر اٹھایا اور اچانک اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ "یہ کیا"؟ اُس نے حیرت سے اُس اجنبی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تابوت میں فاطمہ کے بجائے کسی اور لڑکی کی لاش تھی۔

چند لمحوں تک مصطفٰے کے ہوش گم رہے۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر کار اُس نے بوتل سے دوا نکالی اور اُس اجنبی لڑکی کے ہونٹ کھول کر دوا اس کے منہ میں بھر دی۔ پھر کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا حیران اور پریشان نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس لڑکی میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے ایک جمائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مصطفٰے کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ بیٹھی اور تابوت سے باہر نکل کر اپنے آپ کو مصطفٰے کے قدموں میں ڈال دیا۔

"میں کن لفظوں میں تمھارا شکریہ ادا کروں! تم نے مجھے ہمیشہ کی قید سے نجات دلائی ہے!" لڑکی نے کمزور آواز میں کہا۔

مصطفٰے نے اسے چُپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر پوچھا ــ "اے عزیزہ! یہ کیا اسرار ہے۔ یہاں تمھارے بجائے فاطمہ کو ہونا چاہیے تھا!"

لڑکی نے کہا — میرا نام بھی فاطمہ ہے! اے اجنبی! تم نے وہ پیغام مجھی کو تو بھیجا تھا اور وہ دوا بھی مجھے ہی ملی تھی!"

پھر لڑکی نے بتایا کہ جب بھی کوئی کنیز حرم میں لائی جاتی تھی اسے ایک نیا نام دیا جاتا تھا۔ سو اسے بھی فاطمہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میرے بھائی کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تاسف بھرے لہجے میں اس نے فاطمہ سے درخواست کی کہ وہ اسے اس کی بہن اور زبیدہ کے بارے میں کچھ بتائے۔ تب پر لڑکی نے اطلاع دی کہ وہ دونوں حرم میں ہیں اور وہاں ان کے نام میرزا اور نور محل ہیں۔

جب لڑکی نے یہ محسوس کیا کہ میرا بھائی حالات کی اچانک کروٹ پر دل شکستہ ہو بیٹھا ہے، تو اس نے تسکین و تشفی کے کلمات سے اس کی ڈھارس بندھانی چاہی۔ اس نے کہا: "ایک صورت ایسی ممکن ہے کہ دونوں لڑکیوں کو حرم سے بحفاظت نکال لیا جائے!"

"کیا؟ کیا؟ اے عزیزہ! جلدی کہو!" مصطفےٰ بیقرار ہو کر بولا۔

لڑکی نے کہا "میں سیولیکوس کے حرم میں کوئی پانچ مہینے مقید رہی ہوں۔ پہلے ہی دن سے میں فرار کی

ترکیبیں سوچا کرتی تھی۔ یہ تو میں سمجھتی تھی کہ تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام آسان نہیں۔ بہرحال — محل کے صحن میں ایک فوارہ ہے! ہے نا؟ اس فوارے نے میری توجہ کھینچی تھی۔ شاید اس لیے کہ عین ایسا ہی ایک ویسا ہی ہمارے گھر میں بھی ہے۔ ایک روز میں نے سیولیکوس سے اس فوارے کی تعریف کی اور پوچھا۔ "یہ کس کی صناعی کا نمونہ ہے؟" سیولیکوس نے بتایا کہ خود اس نے بنایا ہے۔ اور اس میں پانی بہت دور کے ایک چشمے سے آتا ہے۔ پانی کی آمد کے لیے ایک سرنگ بنائی گئی ہے، اتنی چوڑی کہ آدمی کھڑا ہو کر بھی آرام سے اس کے اندر چل سکے۔

"یہ سن کر میرے دل میں امید کی ایک کرن چمکی۔ میں نے سوچا، کاش کوئی طاقت ور مرد میرے ساتھ ہوتا اور سرنگ کے دہانے پر جو پتھر رکھا ہوا ہے اسے اٹھا دیتا۔ میں نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی کہ کسی کو میری مدد کے لیے بھیج دے۔"

مصطفےٰ نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لڑکی نے بتایا کہ سرنگ کے دہانے پر رات دن دو پہرے دار متعین رہتے ہیں۔ سو ان سے نپٹنے کے لیے دو ایک اور آدمیوں کی مدد درکار ہوگی۔ مصطفےٰ کو بس اسی بات کی فکر تھی کہ آخر کہاں سے اپنی مدد کے لیے آدمی فراہم کرے۔ دفعتاً اسے ارندان کا عطا کیا ہوا خنجر یاد آیا اور فاطمہ کو ساتھ لے کر وہ آگے چل پڑا۔

شہر میں مصطفیٰ نے ایک طبیب کا سوانگ رچا رکھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے شہر کے مضافات میں ایک بوڑھیا کے ساتھ فاطمہ کی رہائش کا بندوبست کیا۔ پھر جو رقم اس کے پاس بچی رہ گئی تھی اس سے ایک عمدہ گھوڑا خریدا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ ان پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گیا، جہاں پہلے پہل ارندان سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ منزل تک پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔

ارندان کے خیمے وہیں نصب تھے۔ مصطفیٰ کے آنے کی خبر پاتے ہی اس نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مصطفیٰ نے بیتا کہہ سنائی۔ حسن کی غداری کا قصہ سن کر ارندان کا خون کھول اٹھا اور اس نے قسم کھائی کہ اپنے ہاتھوں سے اس ناہنجار کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ اس نے ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔ پھر درخواست کی کہ مصطفیٰ ذرا دم لے، آرام سے کھائے پیے اور سفر کی تکان سے چھٹکارا پائے۔

وہ رات مصطفیٰ نے ارندان کے خیمے میں گزاری۔ آسمان پر جیسے ہی اگلی صبح کی سپیدی نمودار ہوئی، اس نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اب ارندان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ تین ہٹے کٹے جوان بھی ساتھ لے لیے تھے۔ ان سب کے گھوڑے تازہ دم تھے اور ایڑ لگانے پر ہوا سے باتیں

کرتے تھے۔ واپسی کا راستہ انھوں نے دو دن میں طے کر ڈالا۔

شہر تک آنے کے بعد مصطفیٰ نے پہلا کام یہ کیا کہ فاطمہ سے ملاقات کی اور ارندان کی نوازشوں کا حال بتایا۔ پھر اسے بھی ساتھ لے کر سیولیکوس کے محل کی راہ لی۔ جب شام سر پر آ گئی اور پرند اپنے آشیانوں کو لوٹ گئے تو دبے پانو چلتے چلتے وہ سب کے سب سرنگ کے دہانے پر پہنچے۔ فاطمہ نے بتایا کہ صحن میں دائیں بائیں جو دو مینار ہیں، ان میں دائیں طرف والے مینار سے آگے چھٹے نمبر پر ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے سے ہو کر فاطمہ اور زریدہ کے کمرے تک پہنچ سکیں گے۔

مصطفیٰ نے فاطمہ اور اپنی مدد کے لیے ساتھ آئے ہوئے جوانوں کو گھوڑوں کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا اور اچھی طرح مسلح ہو کر اس دروازے کی سمت چل پڑا۔ اس کے ساتھ صرف ارندان تھا۔ دونوں نے اللہ کا نام لے کر سرنگ میں قدم رکھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ کمر تک پانی میں آ گئے۔ دونوں حوصلہ مند و جری تھے۔ ہمت نہ ہاری اور آگے بڑھتے رہے۔ آدھ گھنٹے میں وہ سرنگ کے اس دہانے پر پہنچ چکے تھے، جو سیوکیلوس کے محل میں نکلتا تھا، اور فوارے سے ملحق تھا۔

سرنگ کا دہانہ ایک بھاری پتھر سے ڈھکا ہوا تھا۔ دونوں نے چھڑوں کی مدد سے پتھر کھسکانا شروع کیا۔

ذرا دیر کی محنت کے بعد پتھر کھسک گیا۔ اربذان اور

مصطفیٰ صحن کے احاطے میں پہنچ گئے اور دائیں مینار کی طرف، چھٹے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس مقام پر ایک نہ دو چھ حبشی پہرے دار موجود تھے۔ اے عزیزو! اب اسے اتفاق سمجھو یا مصلحتِ خداوندی کہ سب کے سب اس گھڑی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اچانک حسن کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے اربذان اور مصطفیٰ کو دیکھ کر شور مچایا۔ پہرے دار بیدار ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ حسن کی مدد کو آتے، اربذان جھپٹ کر حسن کے سر پر ہو لیا اور اس ناہنجار کی گردن دبوچ لی۔ وہ مردود اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکا اور جان گنوا بیٹھا۔ اتنی دیر میں مصطفیٰ نے چار پہرے داروں کا کام تمام کر دیا تھا۔ بقیہ دو بھی اُن کے آگے ٹک نہ سکے اور گھٹنے ٹیک دیے۔ اربذان نے ان کے سینوں کی طرف خنجر تان کر پوچھا "میزا اور نور محل کدھر ہیں؟" غلاموں نے بلا آنا کانی کیے ان کے کمرے کا پتا بتایا۔ مصطفیٰ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ فاطمہ اور زبیدہ شور سُن کر پہلے ہی جاگ اٹھی تھیں۔ مصطفیٰ کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آ ئی۔ جلدی جلدی دونوں نے اپنے ملبوسات اور زیورات سمیٹے۔ پھر مصطفیٰ کے پیچھے چل پڑیں۔

اربذان اور مصطفیٰ دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیے اس

مقام پر پہنچے جہاں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ وہاں ارندان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا "کیوں نہ اس محل کا کچھ خزانہ لوٹ لیا جائے!" ارندان نے سختی سے منع کر دیا اور یوں گویا ہوا — "میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے عام قسم کا لٹیرا سمجھیں اور یہ الزام دیں کہ ارندان راتوں کو گھروں پر ڈاکے ڈالتا ہے۔"

حسن کو اپنی غداری کی سزا مل چکی تھی۔ فاطمہ اور زریدہ اس بدبخت کی قید سے رہا ہو چکی تھیں اور خود وہ ملعون قیدِ حیات سے آزاد تھا۔ فاطمہ اور زریدہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ دونوں نے ارندان کی مدد کا شکریہ ادا کیا۔ ارندان نے کہا — "جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل بھاگو! ہو سکتا ہے کہ سپولیکوس کو اس تمام واقعے کی بھنک مل گئی ہو اور وہ اپنی فوج کے ساتھ ہم پر حملے کی تیاری کر رہا ہو۔ مفت میں خون خرابہ ہوگا!"

سب کے سب آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن ارندان نے مصطفیٰ سے رخصت طلب کی۔ مصطفیٰ نے کہا "میں زندگی بھر تمھیں یاد رکھوں گا!"

ارندان نے جواب دیا "اے عزیز! آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔"

دوسری والی فاطمہ نے بھیس بدل کر اپنے وطن کی راہ لی۔ مصطفیٰ، بہن فاطمہ اور اس کی سہیلی زریدہ اپنی جنم بھومی کی سمت چل پڑے۔ واپسی کا سفر تھا اس لیے سب کے حوصلے بلند تھے۔ چند دنوں کے اندر اندر یہ لوگ اپنے شہر کی فصیل تک پہنچ چکے تھے۔

اے رفیقو! جب اس حقیر کے والد بزرگوار نے لڑکیوں کو مصطفیٰ کے ساتھ دیکھا تو خوشی سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دوسرے ہی دن انھوں نے ایک زبردست ضیافت کا اہتمام کیا۔ شہر بھر کو دعوت دی۔ قسم قسم کے کھانے پکوائے۔ تمام مہمان آ چکے تو مصطفیٰ کے حوصلوں کی داد دی اور ارندان کے لیے تشکر کا اظہار کیا۔

مصطفیٰ نے جب اپنا حال کہہ سُنایا تو والد نے زریدہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور مصطفیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے — "اے فرزند میں تجھے سچے دل سے معاف کرتا ہوں اور تیری کارگذاری پر خوش ہوں۔ انعام کے طور پر اس عزیزہ کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔!"

* * *

لیزہ کی کہانی سب نے بہت غور سے سنی۔ ذرا دیر بعد قافلہ آگے کے سفر پر چل پڑا۔ شام ہوتے ہوتے وہ

صحرا کے دوسرے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اب ان کے سامنے ہرے بھرے سبزہ زار تھے اور پھول پتوں سے لدے درخت۔ وادی میں ایک سرائے بھی تھی۔ قافلے والوں نے فیصلہ کیا کہ رات اس کارواں سرائے میں بسر کریں گے۔ وہاں نہ بہت زیادہ گنجایش تھی، نہ کھانے پانی کا کچھ بہت اچھا انتظام تھا۔ مگر سب کے سب خوش تھے اور دل لگی باتوں میں مگن تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کم انتظامی کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ جو کچھ میسّر آیا کھا پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سب حلقہ باندھ کر بیٹھے اور باہم ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ملیچ نے ایک مضحکہ خیز رقص پیش کیا اور گانا بھی سنایا۔

اس کا مسخرہ پن دیکھ کر زالیوکوس جیسے سنجیدہ شخص کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

اب قصہ سنانے کی باری ملیچ کی تھی۔ سب کے سب اس کے قریب کھسک آئے اور ایک دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔

(آگے کی کہانی اس سلسلے کی اگلی کتاب میں)

بھوتوں کا جہاز

شمیم حنفی

یہ کہانیاں بچّوں کے لیے لکھی گئیں۔ لیکن بچّوں اور بڑوں نے ایک سی دل چسپی کے ساتھ پڑھیں۔

حیرت انگیز اور پُراسرار واقعات سے بھری ہوئی کہانیوں کے سلسلے کی پہلی کتاب

مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵